عربستانِ مقدس

تاثرات سفرِ حج

الحاج نواب سر نظامت جنگ بہادر

خطوط کی شکل میں

ترجمہ مولوی نوازش حسن صاحب رضوی ایچ۔ سی۔ ایس

۱۳۷۳ھ

KING FAISAL JHANDIR LIBRARY
MAILSI

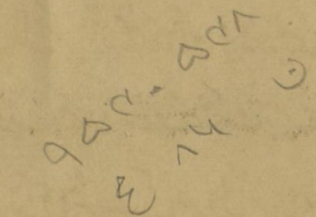

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

میرا بار بار ملک عرب جانا ان لوگوں کے لیے اچھا موضوع بحث بنا ہوگا جو قدرتی طور پر یہ خیال کرتے تھے کہ مجھے اپنے لیے بہشت میں کسی انعام کے حصول کا شوق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شرائط قرآن کے بہ موجب ایک مذہبی فریضہ کی ادائی میرا پہلا مقصد تھا۔ اس کے علاوہ میرے دل میں ایک اور زبردست خواہش موجزن تھی وہ یہ کہ اپنے آپ کو اس ماحول میں دیکھوں جہاں دنیا کے بعض مفلس ترین لوگوں نے بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے۔ میری یہ بھی آرزو تھی کہ اسی صحرا میں جہاں اسلام کی ابتدا ہوئی اسلام کے شاندار آغاز اور کامیاب نشوونما کا ایک خیالی مرقع دیکھوں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے حضرات میری

اس خواہش میں میرے شریک ہیں۔ کیونکہ صحرائے عرب وحی کی سرزمین۔ روحانی فیضان کا سرچشمہ اور ہمارے لیے ارضِ مقدس ہے۔ یہ لق و دق وسنسان اور وحشتناک صحرا اپنی بھیانک وسعتوں کے ساتھ جو حدِ افق سے بھی ماوراء معلوم ہوتی ہیں روح کی بالیدگی کا موجب ہے یہ کسی عظیم غائبانہ اور ہمہ گیر وجود سے معلو معلوم ہوتا ہے۔ جسکے ساتھ روح انسانی ایک باطنی کشش کے تحت شیر و شکر ہو جاتی ہے۔ یہ بیان اپنے آپ کو اس عجیب و غریب افسوں کے سمجھانیکی ایک ناتمام کوشش ہے جس کو بجا طور پر "پیامِ صحرا" کا نام دیا گیا ہے۔

مجھے ایسے وجدان کی تلاش تھی جو خیال کو اس قابل بنائے کہ یادگاروں سے پٹے ہوئے مقامات کی لطیف روحانی تحریک پر تاریخ کے نقوش پارینہ کو دوبارہ مرتب اور اجاگر کر سکے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اسے چشم ظاہر سے دکھائی دینے والے مظاہر سے حاصل نہیں کیا جا سکتا پھر بھی یہ امید تھی کہ میرے اندر یہ روحانی

فیضان ان مظاہر سے وابستہ عجوبہ روزگار کارہائے نمایاں کی یاد سے پیدا ہونیوالے باطنی جذبات کی شکل میں سرایت کریگا چنانچہ میں حالت انتظار میں ارض مقدس پہونچ رہا تھا کہ اس ارض موعود ہی میں اس عجیب وغریب انقلاب کا راز دفن ہے جس نے تاریخ انسانی کے اتنے ناقابل وثوق طور پر مختصر عرصہ میں ایسی عظیم الشان ہیئت اختیار کرلی اور جس نے خیالات کی ایک نئی دنیا۔ ایک نئے تمدن اور ایک نئی تہذیب کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ کسی زمانہ میں صحرائے عرب نے دنیا کے سامنے اسلامی عظمت کا ایک پرشکوہ مرقع پیش کیا تھا اب میرے تخیل میں وہی منظر جاگ اٹھا ہے۔

سمندر پر جھکی ہوئی ڈوور (DOVER) کی سفید پہاڑی چوٹیاں اگر انگریز کو دل وجان سے عزیز ہیں تو مجھے عرب کے ان گندمی ریت کے ٹیلوں سے پیارے جو اس سنسان صحرا کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اسکی زبردست سنسان پہنائیاں پیغمبر کے ارشاد سے

اس پرجوش مذہب کے طفیل مخمور و شرشار معلوم ہوتی ہیں۔
کیا کیا خیالی مرقعے صحرا میں نظر آتے ہیں۔ وہ دکھاتا ہے کہ عرب
کا ستارہ سائرس اعظم کی قلمرو سیریا فلسطین اور مصر پر چمک
رہا ہے جو کبھی سکندر اعظم کے مفتوح جانشینوں کی اقلیم تھی۔
دور مغرب کی طرف یہہ اندلس کی سلطنت پر چمکتا ہے۔
جبل الطارق کی بلندیوں سے رسولؐ کا علم لہراتا ہوا
نظر آتا ہے۔ رزم و بزم کے قدیم مشاہیر اسلام کے نام اور دل
کے لیے جگہ خالی کرتے ہیں خالد سیف اللہؓ کسی ہیکٹر
اور اکلیز سے کم زبردست نہیں سعد بن وقاصؓ ایک
معمولی صحابی تاریخ میں فاتح ایران کا مرتبہ پاتے ہیں اور اسی گروہ
کے ایک دوسرے سادہ مزاج صحابی ابو عبیدہ خلیفہ کے حکم سے
کمان سنبھالتے ہیں اور فاتح شام بن جاتے ہیں یہہ میرے لیے
صحرا کی خاموش رزمیہ نظم ہے۔
لو اخر مارچ ۱۹۳۲ء کے کچھ دنوں تک عرب کے جنوب مغربی

ساحل کے بے کیف ریت کے ٹیلوں کا چکر کاٹنے کے بعد ہمارے جہاز نے جدہ کے سامنے ایک شفاف سبز خلیج میں لنگر ڈالا۔ پانی کی ہلکی ہلکی لہروں پر جھلاتی ہوئی سورج کی روشنی نے میری آنکھوں کو ٹھنڈک اور سرور بخشا جو مکانات کی ان تنگ قطاروں کو دیکھ رہی تھیں جو ساحل سمندر اور حدِ افق تک پھیلے ہوئے ریگستان کے درمیان تھے۔

عرشۂ جہاز سے جدّہ ایک خوبصورت آبی رنگوں کی تصویر معلوم ہوتا تھا لیکن جب ذہن پر اس کی تصویر کھینچتی ہے تو طلوع وغروب آفتاب کے وقت غائب ہوتے ہوئے رنگ نہایت لطیف طور پر اس پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ ایک گونا گونی رنگوں کا گلدستہ معلوم ہوتا ہے۔

جب میں پہلی دفعہ حج کا ارادہ کر رہا تھا تو بعض دل جلے حاجیوں نے دبے الفاظ میں جدّہ کی مذمت کی تھی مثلاً اسکی ویرانی وبے رونقی۔ گرمی وافلاس۔ مکھیوں کے جھنڈ اور اس کا کھارا پانی وغیرہ لیکن ۱۹۳۲ء میں جو میں نے اس کو دیکھا تو دلکش اور سہانا پایا۔

اگر کچھ اور نہ سہی تو مناظر قدرت کی بدولت ہی میرے لیے کافی تھی اور میں نے اس تصویر کی ہر تفصیل اور اس کے ماحول کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا۔ نامانوس عرب لہجہ کی آوازوں نے اس دل آشتی میں اور اضافہ کیا۔ اسکے بعد سے کوئی چیز مجھے جدّہ کو برا سمجھنے پر مائل نہ کر سکی۔

سبز و نیلگوں ساحل والا جدّہ۔ ارض حرم کا باب الداخلہ جدّہ میرے نزدیک صحرائے عرب کی ابتدا و انتہا ہے اور مجھے اس سے جدا ہوتے وقت ہمیشہ رنج ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں پہلے حج سے واپسی کے بعد سے عرب کی پیاری یاد اتنی شدید ہو گئی تھی کہ میں وقتاً فوقتاً نظم و نثر میں اس کا اظہار کرنے پر مجبور رہا۔ نہ معلوم کبھی جدہ نے کسی کے شاعرانہ جذبات بیدار کئے ہیں یا نہیں۔

(بہر حال یہ ایک تحفہ میری طرف سے ہے)

انگریزی نظم کا لفظی ترجمہ۔

تاباں سبز پانی کی پایاب خلیج۔ زمین کی طرف نظر کیجئے تو ایک طرف ساحل سے ٹکراتی ہوئی لہریں نظر آئیں گی اور دوسری طرف بھورے

ریتلے ٹیلوں کے ڈھلوان جس کی گندمی ریت کنارہ افق کو مزین کرتی ہے۔ ان کے درمیان ساحل سمندر سے کچھ بلندی پر مکانات کی ایک پتلی لمبی قطار منظر اس قدر دلچسپ کہ بار بار یاد آئے اور تصور جسے زیادہ حسین بنا دے۔ اسے جتنے دور سے دیکھیے اتنا خوبصورت نظر آتا ہے۔ تصور یا خواب کی طرح حسین گو اس کا غیر ادنیٰ حسن سراب کی مانند معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی ساحل سمندر پر لکڑی کے زینہ کو چھوتی ہے تو یہ تصور پاش پاش ہو جاتا ہے۔

جدہ میں اترنے پر سب سے پہلا تصور یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک شہر خموشاں اور کاہلوں کی بستی ہے۔ جہاں جگہ جگہ کشادہ زمین ہے جسکے چاروں طرف بلند عمارتیں ہیں جن میں آثار حیات ناپید ہیں۔ ساحل پر سمندر کے رخ چند شاندار کھمبے ہیں جن کی بلند چوٹیوں سے آہستہ آہستہ یورپ کے بعض ممالک کے لہراتے ہوئے پرچم نظر آتے ہیں جنھیں حاجی استعجاب اور امید سے بھری ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے کہ شاید انکی موجودگی ان کی دوستانہ ہمدردی اور دلچسپی کا باعث ہے جو عربوں کو

علم۔ تمدن اور شہرت و عزت کے میدانوں میں تیز رفتاری سے اس راستہ پر چلنے میں مدد ہو جس پر وہ پہلے گامزن ہو چکا ہے۔

ان عمدہ گھروں میں سے ایک برطانوی وزیر (حالیہ سفیر) کے قبضہ میں ہے جو پہلے سرکاری طور پر قونصل کہلائے جاتے تھے ۱۹۳۲ء میں مجھے وزیر کی بیوی لیڈی ریان سے ملنے کا موقع ملا۔ SIR ANDREW RYAN سر اینڈرو ئن رخصت پر تھے ان کی لیڈی صاحبہ مجھ پر بہت مہربان رہیں اور میری بڑی خاطر و مدارات کی۔ اس غیر متمدن ریگستانی ماحول میں ایک انگریز کے ڈرائنگ روم میں جا کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ چونکہ یورپین ہمیشہ اپنے ساتھ زندگی کو خوشگوار بنانے کا سامان رکھتے ہیں۔

۱۹۳۴ء میں دوسرے سفر کے موقع پر سر اینڈریو سے تعارف کی مسرت حاصل ہوئی۔ میرا غائبانہ تعارف ان کی لیڈی کرا چکی تھیں اور وہ میری ملاقات کے متمنی تھے بلکہ اپنے لطف آمیز بیان کے بموجب وہ میری آمد کے منتظر تھے۔ میں نے ان کو خلیق و

بردبار پایا۔ ان کے طرز عمل میں خلوص کے ساتھ نہایت اچھی طرح ملی جلی پرانی وضع کا اعلیٰ خاندانی تکلف نہیں شائستگی پائی جاتی تھی۔ اپنی طویل گفتگو میں میں نے ان کو برطانیہ اور عالم اسلام میں باہمی ہمدردی اور دوستانہ اشتراک عمل کی روز افزوں ضرورت پر متوجہ کیا۔ یہ میرے معتقدات میں سے ہے اور رہا ہے بلکہ میری امید ہے جس کو میں بہ خوشی ہاتھ سے نہ دونگا کہ برطانیہ عظمیٰ اور عالم اسلام کے درمیان سچی اور پائیدار رفاقت ایک بین الاقوامی ضرورت ہے

۱۹۳۵ء میں تیسری دفعہ عرب کے سفر میں مجھے پھر سر اینڈریو اور لیڈی رائن سے ملاقات کی خوشی حاصل ہوئی۔ انھوں نے مجھے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا جس میں ہز ہائنس نواب صاحب بھاولپور اور ایک قدیم دوست عبداللہ یوسف علی صاحب بھی شریک رہے یہ ایک مختصر لیکن نہایت دلچسپ صحبت تھی۔ گویا چھوٹے پیمانہ پر مشرق و مغرب کا امتزاج۔ میں اسکی یاد کبھی فراموش نہ کرسکا۔

۱۹۳۸ء میں چوتھے سفر میں مجھے یہ معلوم کرکے سخت افسوس ہوا کہ

وہ برطانوی سفیر البانیہ بنا کر بھیجے جا چکے ہیں اور اس مرتبہ ان دونوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔

جدہ مجھے ایک دوسرے ہندوستانی دوست کی بھی یاد دلاتا ہے جن کے اخلاق اور حسن مدارات کا میں بہت ممنون ہوں خان بہادر احسان اللہ نائب کونسل نے مجھے ہندوستان کے ایک ممتاز نمایندہ کی حیثیت سے بہت متاثر کیا۔ ان کے حالات زندگی بھی عجیب و غریب ہیں۔ معلوم ہوا کہ موصوف اپنے وطن موقوعہ پنجاب سے بچپن ہی میں بھاگ گئے تھے اور مدتوں ایک مفرور کیطرح پھرتے پھرتے عرب پہونچ گئے جہاں مقامات مقدسہ پر حاجیوں کے جوتوں کے نگہبان کی حیثیت سے کئی سال گزارے۔ یہیں سے ان کی قسمت پلٹی اور وہ لوگوں کی نظروں میں آنے لگے بعض حکام کی مدد سے وہ برطانوی سفارت خانہ میں ملازم ہوے اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے یہانتک کہ وہ نائب کونسل بن گئے۔ میں نے ان کو بہت دلچسپ آدمی پایا۔ ان کے مزاج کی سادگی برتاو میں بے تکلفی اور گفتار میں خلوص ان کے خاص خصوصیات تھیں

وہ گفتگو سے کبھی نہ تھکتے تھے اور گفتگو دلچسپ ہوتی تھی۔ حاجیوں کی ہر ممکنہ مدد کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی کی کوئی حد نہ تھی۔ زمانہ حج میں کئی لوگ ان کے یہاں مہمان رہتے اور ہر ایک کے ساتھ خوب خاطر و مدارات سے پیش آتے اور سب کی کافی دیکھ بھال کیجاتی تھی۔ مجھ پر اور میرے ہمراہیوں پر ان کی جو مہربانیاں ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں لیکن ۱۹۳۸ء میں معلوم ہوا کہ وہ بھی کہیں اور چلے گئے ہیں جسکے باعث جدہ کے کونسل خانہ میں خلا سا معلوم ہونے لگا۔

پہلے حج سے واپسی پر میرے ایک دوست نے سوال کیا کہ کعبہ شریف کے ماحول میں پہونچ کر میں نے اپنی روح میں کوئی رفعت یا سرّ معرفت کے جذبات کا کوئی ہیجان محسوس کیا؟ کسی قدر افسوس کے ساتھ مجھے انکاری جواب دینا پڑا۔ کیوں کہ حقیقت یہ تھی کہ مکہ کو میرا پہلا سفر جن حالات میں ہوا انھوں نے مجھ پر سرمستی کا عالم طاری ہی ہونے دیا تھا۔ پہونچنے کے دوسرے ہی دن میں بیمار ہو گیا اور پانچ دن تک فراش رہا۔ اسکے بعد باوجود کمزوری کے کسی نہ کسی طرح طواف کیا اور حج کے لیے

منا کو گیا۔ یہہ ضرور کہوں گا کہ جدہ سے مکہ کو آنے تک ایک عجیب ناقابل بیان حالت انتظار مجھ پر طاری رہی تھی۔ اس حالت کی ابتدا جدہ سے ہوئی اور دوسرے دن تمام مکہ کے سفر کے دوران میں گھرے ریتلے راستہ سے گذرتے ہوئے میں بالکل خود فراموشی کے عالم میں رہا۔ اس پر اسرار منطقہ میں جو حرم یا دارالامان کہلاتی ہے پہونچنے کا مجھے اڑتا اڑتا سا خیال تھا۔ اس وقت رات کی تاریکی مسلط ہو چکی تھی اسکی حدود میں داخل ہونے پر حاجی جو دعائیں پڑھتے ہیں ان سے دور روایات جاگ اٹھتی ہیں جو قرنوں سے اس مقام سے وابستہ چلی آتی ہیں اور خیال اسی فضا میں جا پہونچتا ہے جہاں ہر شئے ایک سنہرا راز ہے۔

انگریزی نظم کا لفظی ترجمہ۔

ہم مقدس سرزمین پر چل رہے تھے جو امن و امان کی قلمرو تھی اسکے گرد نہ کوئی خندق تھی نہ دمدمے نہ کوئی مینار نہ کوئی فوجی دیکھ بھال اور نگرانی تھی اور نہ کوئی پہرہ دار اسکی حدود ایمان کی پٹی سے محصور ہیں۔

اعلاء کلمۃ الحق سے خداداد امن اس قرب وجوار

میں برقرار رہیگا۔

اب بھی اس کلمہ نے جو مسلح افواج کی طاقت سے کہیں

زیادہ طاقتور ہے۔ دشمنی لڑائی اور جنگ وجدال کا

استیصال کیا ہے۔

ایک زمانہ ایسا تھا کہ یہاں کی ہر وادی پہاڑ اور

میدان۔ جواب اس قدر خاموش ہیں قبائلی عداوت

رشتہ داروں کی ہلاکت آفریں نفرت اور جوش انتقام

کی لرزہ خیز داستانوں سے گونجتا رہتا تھا۔

اب امن ہی امن ہے چٹیل میدان دھوپ سے جھلستا

اور تیرگی مائل بھورا پہاڑ تنہائی میں گھورتا رہتا ہے۔

مسکین اونٹ پہاڑیوں پر چرتے پھرتے ہیں۔

ننگے سر احرام باندھے حاجی ریت اور بالو کی سرزمین

پر اعلان امن کا ثبوت دے رہے ہیں۔ یہاں ہر چیز خاموش ہی

سکوت ہی سکوت ہے۔

یہہ چارسو بنجر ویرانہ جس میں خوفناک سکوت ہے

ابتداً مایوسی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ موٹر کار پر چلتے وقت

اسے دیکھتے ہوئے میں غرق حیرت ہو گیا کہ اس ویران منطقہ

میں ابید کس طرح ممکن ہوئی تھی تقریباً ایک گھنٹہ اس لوٹ

پھیر میں گذرا ہوگا کہ اچانک میں نے اپنے دل میں قرآن کا

مسرور کن اور گونجتا ہوا پیغام سنا گویا کسی نے بآواز

بلند پڑھا ہو۔ "خدا کی نعمتیں بے حساب ہیں"۔

انگریزی نظم کا ترجمہ:۔

صرف ریت اور مہیب پہاڑیاں۔ نہ چشمہ اور نہ ندی کے کنارے

بامروت کھجور کے درخت جو سر جھکا کر صحرا نورد کو دعوت دیں

یہاں قحط زدہ فطرت ترشروئی سے پیش آتی ہے۔

اس دشت میں چلنے والے خستہ حال بہادروں کو مبہم خطرات ڈراتے ہیں۔

لیکن اس جھلستی ہوئی ریت اور بنجر زمین ہی سے خدا کی تلاش میں

سطوت و جبروت کے دوش پر سوار ایک پرجوش
ہستی شبہ اور خوف سے گزر کر مذہب کی نمایاں بلندیوں
پر پہونچ گئی۔

ہر نظر ایک خواہش ہر خواہش ایک عبادت
کیا حیرت انگیز خزانے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں
اسکی آنکھ کے سامنے خالق کی فیاضی کے نمونے
اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے ریت کے دانے یا
سورج کی کرنوں سے منور ہوا میں گرد کے ذرّات
نوزائیدہ طاقت سے دل کی خواہش پوری ہوگئی
بے آب و گیاہ صحرا میں بہشت کی سی بہار آگئی۔

یہ ہے منظر کہ۔ منا اور عرفات مقام حج کا جہاں روح تجلیات الٰہی کی متلاشی رہتی ہے۔ ہر شخص کو یہ توقع ہوتی ہے کہ کعبہ کو سب سے پہلی دفعہ دیکھکر وہ اچانک خود کو ایسے عالم میں محسوس کریگا جو حواس کی حد سے بالاتر ہے لیکن میں اتنا خوش نصیب نہ تھا۔

بخار اور حلق کے ورم کی وجہ سے کمرے ہی میں پڑا رہا۔ اتنی طمانیت
ضرور ہوئی کہ میں نے اپنی نشست سے اذاں کے سریلے اور رچتے
ہوئے نغمے سنے جس میں مسحور کن گونج تھی۔ ہوا کی موجوں پر سوار
کبھی ایک طرف سے اور کبھی دوسری طرف سے آتے ہوئے معلوم
ہوتے تھے۔ اور ان میں کان کے راستے دل میں اتر جانے کی
صلاحیت تھی۔ پہلی دفعہ سننے پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری
دنیا سے آرہے ہیں اور یہی وہ زیادہ سے زیادہ عارفانہ جذبہ تھا جو
مجھ پر طاری ہوا۔

کچھ دنوں بعد جب میں فی الحقیقت حرم کعبہ میں طواف کے
لیے داخل ہوا تب بھی مجھے کسی باطنی جذبہ شدید احساس نہیں ہوا
پتھر کا فرش جہاں طواف کرنا تھا گرم تھا۔ اور اس رسم کی تکمیل
کرانے والے معلم نے اسے بے کیف عجلت کے ساتھ انجام دیا۔ وجہ یہ تھی کہ
ہمیں مقام حج منا کے لیے روانہ ہونا تھا اس لیے ذکر و دعا کے لیے
وقت نہ تھا۔ اگلے تین دن منا پر جو ایک ہولناک ناہموار پہاڑی

وادی ہے دوسرے دن عرفات اصل مقام حج کا سفر اور منا
میں شیطان (جسکی تشبیہ اس سے متعلقہ ایک مقام میں اینٹ چونا
اور پتھر سے بنے ہوئے مناروں کی شکل میں قایم کی گئی ہے)
پر کنکریاں پھینکنے کی قدیم رسم سب دلچسپ اور حیرت انگیز گذرہے۔
منا کا منظر مخصوص شان و شکوہ کا حامل ہے۔ ایک تنگ
وادی کے دونوں طرف ننگی، وحشتناک پہاڑیاں ہیں ان پر کسی قسم
کی سبزی ہے اور نہ کوئی پودا ہی نظر آتا ہے لیکن اس سے انکے
پیام امید و بیم میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ میرے تصورات میں منا
اپنے اس افسوں سے وابستہ ہے جو صدیوں پرانا ہے اور اس
سے وہاں کے رہنے والے سابق بزرگوں کی سخت قناعت کی یاد
آتی ہے۔ ان کی روح اب بھی ان بظاہر غیر متواضع پہاڑی ڈھلانوں
اور خلاؤں میں چکر لگاتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حاجی کی روح
کی ترک لذات دنیا کی طرف رہنمائی کرتی ہے تاکہ قرب خداوندی
کی بڑھتی ہوئی خواہش کے ذریعہ مقصد حیات تک رسائی ہو جو حج کا

باطنی مقصد ہے۔ حج پرستش حق کی ایک ظاہری شکل ہے۔ اس کی ظاہری رسوم روح میں پیدا ہونیوالی ایک ناقابل مزاحمت خواہش خواہش وصل کا اظہار ہیں۔ اس رسم کے اجزاء بعض انبیاء اللہ کے افعال کی تقلید سے زیادہ نہیں جنھوں نے اس لق و دق سنسان بیابان میں جہاں چاروں طرف بحر ریت ہی ریت نظر آتی تھی سیاہ خوفناک پہاڑیاں ڈراتی تھیں اپنی زندگی قرب خداوندی کے لیے وقف کر دی تھی۔ صنعت الٰہی کی یہ خاموش نشانیاں اس کے عفو اور رحم کے پیامات پہونچاتی تھیں جسکی طاقت ازلی اور زندگی بخش ہے گو بہ ظاہر اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ انھوں نے وہ سب چیزیں پالیں جسکی ان کی باطنی زندگی کو ضرورت تھی۔ زندگی بھر خود کو مٹا دینے والے کام کے صلہ میں انھیں قلب مطمئن ملا دنیوی زندگی کی مکروہ دلچسپیوں اور فضولیات سے کنارہ کشی سے ان کا مقصد یہ تھا کہ روح کی زندگی کے ابدی جوہر کو اور اچھی طرح حاصل کر سکیں۔

منا، کا تین دن کا قیام۔ عرفات کی بحر ریت پر گذرا ہوا دن

اور مزدلفہ کا سفر جہاں رات تاروں بھرے آسمان کے نیچے گذاری جاتی ہے۔ یہ سب علامتی افعال اس تلاش کا جز ہیں اور مذہب کی ایک مسلمہ رسم بن چکے ہیں۔

میرے نزدیک حج کے معنی کی یہ معقول تشریح ہے پیغمبر اسلام دین ابراہیمؑ کے پیرو اور اس کے شارح تھے۔ اس لیے ان کا دستور ہو گیا کہ ابراہیمؑ کی طرح اپنے متبعین کی حیات ابدی یعنی لازوال حقیقت کی تلاش میں رہنمائی کریں۔ مسلمانوں کو حج کی گہری اہمیت کبھی فراموش نہ کرنی چاہیئے۔ اور اس کی ظاہری رسوم کو انہیں رواج سے زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیئے۔ ان میں سے ہر ایک کو خود اپنے اندر وہ گمنام خواہش پیدا کرنی چاہیئے۔ جو ترک نفسانیت کی شکل میں ظاہر ہونے کی کوشش کرتی ہے تاکہ فاتح روح اپنے خالق کی قربت حاصل کر سکے۔

مکہ پہونچتے ہوئے سب سے پہلی نمایاں چیز ایک ننگی پہاڑی ہے جو تنہا ایک ریتلے میدان میں کھڑی ہے اور اپنے عقب کی پستی کو ناظر کی نظروں سے چھپا لیتی ہے اور قریب ہونے پر ذرا آگے

ایک اور پہاڑی ملتی ہے جس کا چکر کاٹنا پڑتا ہے اور پھر اسی طرح کی ایک اور پہاڑی نظر آتی ہے جسکے ذرا آگے آبادی کے کچھ منتشر نشانات معلوم ہونے لگتے ہیں اور آگے بڑھنے پر تیرگی مائل بھوری پہاڑیوں کے دامن میں عمارتوں کے جھنڈ قطاروں میں دکھائی دیتے ہیں سب سے بلند عمارتیں پہاڑ کی چوٹی کے قریب واقع ہیں۔ کعبہ ان مدور پہاڑیوں سے محصور رقبہ میں پیالی کی مانند ایک گہری جگہ میں ہے۔ چاروں طرف پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر دو۔ دو۔ تین۔ تین منزلہ عمارات باقاعدہ طور پر اوپر نیچے واقع ہیں۔ عمارتوں سے ڈھکی ہوئی یہ پہاڑیاں اس حصار کی قدرتی دیواریں ہیں جس میں خانہ خدا کعبہ واقع ہے۔ مکہ کے پہاڑی حصار کا منظر جس پر عجیب عجیب وضع کی تصویر جیسی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ لاثانی حسن و دل آویزی رکھتا ہے۔ بعض وقت میں وہاں شہری آرائش۔ سڑکوں کی تعمیر۔ ڈرینج اور دوسرے افادیت والے کاموں کے خواب دیکھتا ہوں لیکن یہ ضروری ہے کہ موزوں عمارات وغیرہ کے اضافہ سے شہر کی کاٹ چھانٹ اور صورت گری کسی حسن کارانہ

مذاق کی رہنمائی میں کیجائے تاکہ شہر کی یکتا حیثیت کو محفوظ اور ہمیشہ برقرار رکھا جاسکے۔ جس کے ساتھ روحانی رشتوں کا ایک طویل سلسلہ وابستہ ہے۔

یہ مقامات مقدسہ کی موجودہ حالت افسوسناک ہے۔ حیرت اور تاسف کا مقام ہے کہ مسلمانان عالم اتنے طویل عرصہ سے ایسے شاندار اور بے مثال آثار کی حفاظت کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ مجھے امید ہے کہ موجودہ بادشاہ جو غیر معمولی صلاحیت اور نہایت روشن دماغ رکھتے ہیں اور جن کو اس کا ہمہ وقتی احساس ہے کہ مکہ اور مدینہ عالم اسلام کے دو درخشاں مراکز کی طرح کیسی برتر حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے دور حکومت میں اس کی تکمیل کر سکینگے۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے اس سے تو یہی توقع بندھتی ہے کہ وہ اپنے دماغ میں انکی ترقی۔ ان میں موجودہ زندگیوں کی آسائشوں میں اضافہ۔ تجارت کیلئے خاص سہولتوں کی فراہمی تاکہ مرفہ الحالی میں اضافہ ہو۔ ان سب کی بڑی بڑی تجاویز تشکیل دیے ہیں اگر تمام دنیا کے دولتمند اشخاص ملکر

اپنے اپنے ذرائع سے ان کی مدد کریں تو بہت کچھ انجام پا سکتا ہے کام کرنیکی مثال بیت المقدس کی تجدید کی شکل میں حال ہی میں یہودیوں نے پیش کر دی ہے۔

طائف میں ہمارے قیام کی مسرتوں کو میرے دوست شیخ عبداللہ سلیمان کی مہربانی اور مہمان نوازی نے دوبالا کر دیا۔ انھوں نے نہ صرف ہمیں اپنے مسکن "بستان ہوائیہ" میں ٹھہرایا بلکہ ہماری شاہانہ خاطر و مدارات بھی کی۔ عربوں کی مہمان نوازی سنی تھی یہاں عملاً دیکھ لیا بلکہ مجھے اور میرے ہمراہی دس افراد پر مشتمل جماعت کو اس احساس پر مجبور ہونا پڑا کہ ہم اس مہمان نوازی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے مجرم نہ بن جائیں حالانکہ وہ خود یمن کو (برسرِ جنگ) گئے ہوئے تھے اس وقت حجاز و یمن کے درمیان ہو رہی تھی۔ لیکن ہماری خاطر و مدارات ان کے آدمی اسی طرح کرتے تھے گویا وہ خود ان کی نگرانی کر رہے ہیں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ لیکن مجھے توقع ہے کہ موصوف میرے احساس تشکر کو ضرور تسلیم کریں گے۔

طائف ایک پہاڑی مقام ہونے کے لحاظ سے صحت گاہ کے لیے نہایت ہی موزوں شہر ہے جس طرح ہندوستان میں نیلگری اور دوسرے پہاڑی مقامات ہیں۔ موسمی اعتبار اور حالات کی یکسانیت کے باعث یہاں مجھے کوئٹہ یاد آگیا۔ یہاں کی زمین گو ابھی غیر مزروعہ اور چٹیل ہے لیکن اس میں باغات کی زمین بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ دمن میں ہر دو مقامات کا تقابل کرتے وقت جن میں ایک خالی اور افتادہ ہے اور دوسری نہایت خوبصورتی سے بنائے ہوئے باغوں اور گوناگوں رنگوں کے پھولوں سے لہلہاتی ہوئی سرسبز و شاداب۔ مجھے اس اختلاف کے پیش نظر سخت ترغیب ہوئی کہ تصور ہی میں ایک کو دوسرے سے بدل دوں اور وہ توقع جس نے یہ تصویر کھینچی تھی اب بھی قائم ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہم بستان میں کئی دفعہ ملے اور بڑی خوشگوار گفتگو رہی۔ مجھے افسوس اس کا ہے کہ آپ اس دوپہر کی دعوت میں شرکت نہ فرما سکے۔ جب مفتی اعظم فلسطین اور محمد علی لوبا پاشا مصری۔

اور شکیب ارسلان کو جو اس وقت طائف میں شاہی مہمان تھے مجھے مدعو کرنے کی مسرت حاصل ہوئی۔

طائف کے دوران قیام میں مجھے جلالۃ الملک کے درباریوں کی ایک جماعت نے شرف ملاقات بخشا۔ مجھے پہلے سے علم نہ تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ لیکن ان کی آمد پر میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ ان سے کس موضوع پر گفتگو کروں۔ خوش قسمتی سے میرے خیال میں یہ آیا کہ یہ نجدی ہیں اس لیے نجدی گھوڑوں کی مشہور اقسام سے دلچسپی کا اظہار بے محل نہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے دریافت کیا کہ ان کی دانست میں نجدی گھوڑے کی بہترین نسل کا شجرۂ نسب کتنا طویل ہو سکتا ہے اور انھوں نے بلا توقف جواب دیا کہ یہ سلسلہ نسب شاہ داؤد علیہ السلام کے وقت تک جاتا ہے اس پر میں نے کسی بے اعتباری کا اظہار نہیں کیا۔ کیوں کہ میں نے خیال کیا کہ اس بیان کی صداقت عقیدت ہی پر مبنی ہے۔

ونیز مجھے ایک قرآنی آیت کا بھی خیال آیا جس میں شاہ داؤد کے گھوڑوں کا تذکرہ ہے۔ عرب کے پہلے سفر ۱۹۳۲ء سے لیکر آخری سفر ۱۹۳۹ء تک

ہمیشہ اور ہر دفعہ مجھے از سر نو یہی امید رہتی تھی کہ شاید میں اصلی نجدی گھوڑا دیکھ سکوں گا۔ لیکن ہر دفعہ مجھے مایوسی ہوئی۔ بچپن سے مجھے گھوڑوں سے محبت رہی ہے اور میں نے مختلف ممالک کی مختلف قسموں کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہے لیکن میری دانست میں عرب گھوڑا تخلیق کا شاہکار ہے۔ گھوڑ دوڑ کا ایک مشہور گھوڑا ECLIPSE ایکلپس ڈارلی کی شرطوں میں جیتنے والا نہایت اعلیٰ النسل کا مورث اعلیٰ عرب گھوڑا تھا۔ جو بھی ہالینڈ یا بلجیم میں گاڑی کھینچتا تھا۔ کسی شخص نے جو اچھے جانوروں کے پرکھنے کی بھی مہارت رکھتا تھا۔ اس کا انتخاب کر کے انگلستان بھیجدیا جہاں اس نے اپنی نسل کی بدولت لافانی شہرت حاصل کی۔ کیا آپ نے وہ مشہور کہاوت سنی ہے۔ ایکلپس سب سے آگے اور باقیماندہ کا کوئی مقام نہیں۔

"ECLPSE FIRST & THE REST MA WHERE"

یہ ہے ایکلپس کے کارناموں کی تاریخ۔

کرنل ٹوڈی نے نصف صدی قبل عرب گھوڑوں پر ایک

کتاب لکھی تھی۔ جس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں اب بھی محفوظ ہے۔ کرنل مذکور عرب گھوڑے کا شیدائی تھا اور تقریباً ستر سال قبل اس نے میر اکبر علی خاں نامی ایک صاحب کو اعلیٰ نسل کی ایک جوڑی حیدرآباد لانے کے لیے عرب بھیجا تھا۔ بچپن میں میں نے یہ قصہ داستان جنگ کیطرح سنا اور ابھی تک یاد ہے۔

میر اکبر علی خاں صاحب میرے والد کے دوست تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں وہ حیدرآبادی رسالہ کنٹنجنٹ کے سلحدار کی حیثیت سے لڑے تھے۔ اور ایک انگریز عہدہ دار کی جان بچائی تھی اس طرح ممتاز ہونے کے بعد ان کو محکمہ خبر رسانی میں ملازمت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اور جب کمانڈر انچیف سر رابرٹ نیپیئر MAGDALA مگدالا کے خلاف ابی سینیا (حبش) کو گئے تو میر اکبر علی خاں اس مہم میں ان کے ہمرکاب تھے۔ جاسوس کی حیثیت سے ان کے خدمات اس قدر مفید ثابت ہوئیں کہ سرکاری روبکاروں میں انکا تذکرہ کیا گیا اور ان کو جدید قایم شدہ اعزاز (ستارہ ہند) اسٹار آف انڈیا سے

نواز آگیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس بیان کے لیے جو بظاہر غیر متعلق معلوم ہوتا ہے لیکن عرب گھوڑوں کے تعلق سے پیدا ہوا۔ معاف فرمائینگے۔

عرب کی مسلسل سیاحتوں سے ثابت ہوا کہ مہمان نوازی عربوں کی فطرت ہے یہ ہزاروں سال سے قایم ہے اور مختلف اوقات میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہی۔ ظہور اسلام سے قبل بھی یہ ایسی ہی مؤثر رہی ہوگی جتنی نزول قرآن کے بعد جس میں یہ حکم بار بار دھرایا گیا ہے کہ پروردگار نے ہم کو جو کچھ کھانے کو دیا ہے اس میں سے ہم دوسروں کو بھی کھلائیں۔ عرصہ تک میں یہ سمجھتا رہا کہ یہ قرآن کا سبق ہے جس نے عرب کو اتنا مہمان نواز بنا دیا جیسا وہ آج ہے لیکن حاتم طائی کی سی مہمان نوازی کی غیر معمولی مثالیں یاد کر کے مجھے اپنی رائے بدلنا پڑی۔ ممکن ہے کہ حاتم کا اپنے مشہور گھوڑے کو حلال کر دینے کا قصہ فرضی ہو جو ملک بھر میں لاثانی تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک بہت پرانا قصہ ہے اور غالباً وہ کسی واقعہ پر مبنی ہوگا۔ ہم عرب کے دل میں جو ناقابل تسخیر جذبہ مہمان

نوازی پر اکساتا ہے۔ اسکی تشریح کے لیے میں اسے استعمال کرتا ہوں۔ عرب کے دوسرے سفر کے دوران میں مجھے جو خوشگوار تجربات ہوئے ان میں سے دو ایک بیان کروں گا۔

مدینہ سے ایک منزل دور ہماری موٹر خراب ہو گئی اور ڈرائیور کے ٹھیک کرنے تک ہم کو مجبوراً اتر کر ریت پر ٹہلنا پڑا میری بہن اور بھتیجی مجھ سے چند قدم آگے نکل گئیں اور ایسی جگہ پہونچ گئیں جہاں تمام چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان میں دو لڑکے آگ پر جھکے ہوئے تھے ہمت کر کے یہ دونوں قریب گئیں کہ دیکھیں کہ یہ عرب بچے آگ سے قریب کیا کر رہے ہیں۔ وہ دونوں چائے بنا رہے تھے ان کے پاس ایک کیتلی ایک چھوٹی کشتی اور چند ایسے گلاس تھے جو اس ملک میں چائے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جیسے ہی انھوں نے خواتین کو اپنی طرف آتے دیکھا وہ اٹھ کھڑے ہوئے کیتلی میں سے چار گلاسوں میں ڈالی کشتی لیکر بڑھے جبلی شرافت اور خوش ادائی کے ساتھ چائے پیش کی۔

دوسری خوشگوار مثال جو یاد آتی ہے وہ اس غریب دیہاتی آدمی کی ہے جس نے ہم کو مسجد قبہ کے قریب لب سڑک اپنے چھوٹے سے باغ میں مدعو کیا تھا۔ ایک دن دوپہر کے قریب سڑک پر تیز تیز چلتے ہم اپنی جائے رہائش کی طرف جا رہے تھے کہ ایک آدمی نے جو لب سڑک ٹھہرا ہوا تھا ہمیں مخاطب کیا۔ بڑے دلپسند پر تبسم اور التجائی انداز سے اس نے ہم سے باغ میں چلنے اور چائے پینے کی درخواست کی۔ چونکہ دیر ہو چکی تھی اور ہم کو ان دوستوں کے پاس واپس پہونچنا تھا جو ہمارے منتظر تھے۔ اس لیے ہم نے اس وقت اس سے معافی چاہی اور وعدہ کیا کہ اگر وہ اجازت دے تو ہم دوسرے دن علی الصبح آئیں گے۔ دوسرے دن ہم نے وعدہ پورا کیا۔ اور جب ہم اس مقام پر پہونچے جہاں وہ ہمارا استقبال کرنیوالا تھا۔ تو ہم نے اس کو اپنا منتظر پایا۔ اسکے چہرہ پر تبسم تھا۔ ہمیں اپنے مہمان کی حیثیت سے خوش آمدید کہتے ہوئے اُسے جو خوشی ہوئی الفاظ سے زیادہ حرکات سے اس کا اظہار ہوتا تھا وہ ہم کو اس جگہ لیگیا جہاں چائے کا سامان جمایا گیا تھا اور ہم

لیمو کے درختوں کے سایہ میں بیٹھ گئے اور اس نے اپنی بنائی ہوئی چاء پیش کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاء کی یہ دعوت ان بہترین دعوتوں میں سے ایک ہے جن میں شریک ہو کر میں محظوظ ہوا تھا یہ خالصتہً قلبی دعوت تھی۔ ہم ایک گھنٹہ اپنے میزبان کے ساتھ ٹھہرے اسکی گفتگو بھی اسی قدر خوش کن تھی جس قدر اس کی چاء ہے۔ اسکے سب الفاظ سمجھے بغیر بھی ہم اس کا مطلب سمجھ جاتے تھے۔ جس کا اظہار اس کے چہرہ اور طرز ادا سے ہوتا تھا۔ آخر کار جب رخصت کا وقت آیا تو ہمارے ساتھ مہمان نوازی کی قبولیت پر شکریہ کا اعادہ کرتے ہوئے ہمارے ساتھ سڑک تک آیا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کے نزدیک وہ دن یوم عید کے برابر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی دوسرے ملک میں اسکی برابر مثال پیش کرنا آسان نہ ہو گا۔ شدید تفاوت کیوجہ سے مجھے OLIVER GOLDSMITH الیور گولڈ اسمتھ کی حسب ذیل سطور یاد آ گئیں جو کئی سال قبل پڑھی تھیں:

یا آگے جہاں تند خو کارنتھیا کا گنوار۔
بے خانماں اجنبی کو دیکھ کر اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے۔

میں ان دونوں تصویروں کو پاس رکھ کر دیکھتا ہوں تاکہ عرب
کی مہمان نوازی کی قدر سمجھ سکوں۔ جو بہشت سے عطا کیا ہوا ایک ربانی تحفہ ہے۔
مکہ کی سیاحت میں مجھے ہر دفعہ ہز مجسٹی عبدالعزیز ابن سعود
سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ میں ان کو بہت بڑا آدمی سمجھتا ہوں
ان کے حیرت انگیز کارناموں کی وجہ سے نہیں بلکہ خصوصیت سے اسلئے
کہ وہ ایک سچے اسلامی فرمانروا کا نمونہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ
تاریخ اسلام کے پس منظر سے نکل کر آئے ہیں۔ میدان جنگ میں طاقتور
نبرد آزما معاملات میں ایک زیرک اور محتاط رہنما۔ اور سادہ لباس
میں ملبوس خلیق شفیق۔ نرم آہنگ مسلمانوں کے سپہ سالار۔ وہ مجھے
ان بڑے آدمیوں کی یاد دلاتے ہیں جن کے وہ دور کے وارث ہیں
اور فی الحقیقت بعض خصوصیات کے لحاظ سے میں نے لوگوں کو خلیفۂ
ثانی حضرت عمر فاروق رضؓ سے ان کا تقابل کرتے ہوئے سنا ہے۔
ان چیزوں کے باوجود مغربی دنیا سے معاملات کے وقت وہ بالکل
عصری اور مدبر سیاس بن جاتے ہیں۔

۱۹۳۲ء میں پہلی دفعہ جب میں نے ان کو دیکھا تو میں ان کے سادہ لباس اور فطری برتاؤ اور بے تکلفانہ شائستگی سے متاثر ہوا۔ جب میں قریب پہونچا تو وہ مجھ سے ملنے کے لیے سروقد کھڑے ہو گئے اور مجھے ان کے بارعب بلند و بالا قامت کو دیکھنے کا پورا موقع ملا۔ عربوں کے معمول کے بموجب وہ ڈھیلے لباس میں ملبوس تھے۔ سر پر سنجد کی ایک سخت و سفید دستی اوڑھے ہوئے تھے جس کے اوپر عقال لگی ہوئی تھی۔ ان کے لباس سے کسی چیز سے ان کے برتاؤ میں مطلقاً کوئی شان امارت نہ تھی۔ ان کی نگاہ۔ لہجہ۔ انکا ضبط۔ ان کے برجستہ سلجھے ہوئے جوابات سب ظاہر کرتے تھے کہ وہ غیر معمولی خداداد جوہر رکھنے والے قابل آدمی ہیں جو ہر دشوار کام میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔

دوران گفتگو میں ہمت کر کے اشارۃً جب میں نے کہا کہ ان کی میراث بہت شاندار اور تاریخی ہے اور تمام اسلام کی خوش بختی سے وہ اس کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان کو اپنے مرتبہ کی سطوت کے بجائے اسکی ذمہ داری کا زیادہ احساس ہے۔

انھوں نے اپنے صرف ایک کام یعنی تمام ملک میں قیام امن وامان کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے اس کا ذکر اس طرح کیا گویا وہ اظہر من الشمس ہے لیکن اس بیان میں کسی فخر کا احساس نہیں تھا۔ بعد میں صحرا میں جدہ سے مدینہ تک ڈھائی سو میل کا سفر کرتے ہوئے مجھے اس بیان کی پوری اہمیت محسوس ہوئی۔ یہ سفر پوری طرح خطرات سے پاک اور پر امن تھا۔ کہیں کہیں ہم کو بہت سی عورتیں اور بچے روٹی مانگتے نظر آئے ان میں سے بعض ہاتھ دھوکر پیچھے پڑ جاتے تھے لیکن ان میں سے بدتمیز کوئی نہیں تھا۔ دو ایک دفعہ جب ہماری موٹر خراب ہو گئی اور ہم کو راستے کئی گھنٹے ریت پر گذارنے پڑے تو بھی ہم خود کو گھر کی طرح محفوظ سمجھتے تھے۔ بعض وقت جب اچانک تاریکی میں سے کوئی آوارہ گرد نمودار ہوکر موٹر کے قریب آتا اور پینے کے لیے پانی مانگتا تو ڈرائیور ہمکو فوراً ہماری طرف پلٹ کر کہتا کہ اگر چند سال قبل ان ہی حالات میں یہ شخص ہمیں ملتا تو لوٹ لیتا۔ ایسے ہی موقعوں پر بادشاہ کے قایم کردہ امن کا مفہوم پوری طرح میری سمجھ میں آتا تھا۔

۱۹۳۵ء میں حج کی دوسری صبح کو جب علی الصبح بادشاہ طواف کی غرض سے کعبہ کو آئے تو چند بدمعاشوں نے جو حطیم کی دیوار کے پیچھے چھپے ہوئے تھے بادشاہ کی جان لینے کی ناکام کوشش کی۔ جب بادشاہ اور ان کے ہمراہی اسکے سامنے سے گذرے تو خنجر ہاتھوں میں لیے ہوئے دو تین آدمی ان پر جھپٹے۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کے آفریدی محافظ دستہ نے جن کے پاس بھری ہوئی بندوقیں تھیں فوراً فائر کیا۔ اور ایک حملہ آور کو مار ڈالا بھاگنے والا دوسرا حملہ آور بھی چند قدم کے آگے گولی سے ٹھنڈا کر دیا گیا۔ بادشاہ اپنی عادتی رحم دلی سے اس قتل و خون کو روک دینا چاہتے تھے لیکن ان کے کچھ کہنے سے قبل ہی سب کچھ ہو چکا تھا۔ اس دوران میں اسی ٹولی میں کا ایک شہدہ جو چھپا بیٹھا تھا دلیعہد پر حملہ آور ہوا۔ اور ان کے کندھے کو زخمی کیا۔ بادشاہ کا ضبط و تحمل حیرت انگیز تھا وہ بالکل غیر متاثر تھے اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ طواف کے باقی چکر پورے کیے۔ اسکے بعد نماز ادا کی۔ اور مقررہ رسوم عبادت اسطرح

ادا کیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ جب وہ حرم مقدس سے باہر تشریف لا رہے تھے تو انھوں نے پولس کو ہدایت کی تھی کہ مقتولین اور قیدیوں کو مناسب تحقیقات تک بہ حفاظت تحویل میں رکھا جائے بعد میں پتہ چلا کہ مجرمین یمن کے باشندے تھے اور وہ شاہی حکم سے سفیر یمن کے حوالے کر دیے گئے کہ وہ جو مناسب سمجھیں ان کے ساتھ کریں۔ سعودی بادشاہ کی یہ بے تعصبی بلاشبہ عالی ظرفانہ تھی لیکن اس سے ان کے غیر معمولی تدبر کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ بادشاہ یمن کو (جنکے تعلقات شاہ ابن سعود سے خوشگوار نہیں) بھی یہ محسوس کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہوگا کہ ان کے انتہائی طاقتور حریف میں کس غضب کی قوت خود اعتمادی ہے۔

شاہ موصوف کی خدمت میں جب میں علیا حضرت بیگم صاحبہ حیدرآباد کی طرف سے مبارکباد پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا تو وہ منا میں اپنے کیمپ میں تھے۔ کیمپ کے گرد نہ تو فوجی پہرہ تھا اور نہ کوئی خاص انتظامات تھے۔ دربار حال کا مجمع بھی حسب معمول تھا۔ بادشاہ

بھی اپنے معمولی سکون سے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرہ پر تبسم تھا۔
میں نے انھیں بیگم صاحبہ کا پیغام پہونچایا اور ساتھ ہی خود بھی
یہ کہتے ہوئے مبارکباد پیش کی کہ غالباً خدا نے اس لیے ان کی جان
بچائی ہے کہ ابھی دنیا میں ان سے اور کام لینا ہے کیونکہ اس دور
میں صرف وہی ایسے آدمی ہیں جو اپنے ملک کی بہترین خدمت
کر سکتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ

"مجھے اپنی زندگی کی کوئی فکر نہیں۔ فکر ہے تو صرف یہ کہ
جب تک زندہ ہوں اپنا فرض انجام دیتا رہوں"

یہ کتنے سادہ عالی ظرفانہ اور مردانہ الفاظ تھے جو ان کے
وسیع قلب سے برجستہ نکلے۔ یہ الفاظ گہرے معنوں سے پُر اور سچے تھے
کیونکہ یہ اس شخص کی زبان سے ادا ہوئے تھے جو سیکڑوں جنگوں
میں لڑ چکا تھا جسکے نزدیک موت صرف فرض کا نام تھا۔ اور فرض
اصل حیات۔ عالم اسلام کے لیے یہ ایک تسلی بخش اور امید افزا پیغام
ہے۔ اُس وقت میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ امیر المومنین کی حیثیت

سے عالم اسلام کا صدر بننے کے لیے ان سے زیادہ موزوں اور کوئی نہیں۔ خدا نے انہیں وہاں رکھا ہے کیونکہ صرف وہ ہی ایسے عرب ہیں جن میں اس نفاق اور انتشار کے زمانہ میں خلافت راشدہ کے دور حکمرانی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی عدیم النظیر شخصیت میں خلفاء کی روحانی عظمت کی ہلکی سی روشنی نمایاں ہے۔ دعا ہے کہ ان کا دور حکومت طویل اور بار آور ہو۔

اپنے روزمرہ کے نظام العمل میں وہ وقت کے شدت سے پابند ہیں ایک مشرقی حکمراں میں ایک انوکھی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لوگوں نے بیان کیا کہ ان کا تمام دن اور رات کا بیشتر حصہ کسی نہ کسی کام میں گزرتا ہے اور وہ صرف چند گھنٹے آرام کرتے ہیں۔

آرمسٹرانگ نے اپنے کتاب میں شاہ عرب کی ایک شاندار پوری تصویر شایع کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصویر بول اٹھیگی۔ ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو یہ کتاب پڑھنی چاہیئے "سعودی عرب" مصنفہ مسٹر فلبی بھی ایک اچھی تاریخی سوانحعمری ہے

۱۹۳۵ء میں ہز اگزالٹڈ ہائنس آف حیدرآباد کے سفر میں ہمرکاب تھا۔ یہ میرا تیسرا سفر تھا۔ اس موقع پر مجھے بادشاہ کے دوسرے فرزند گورنر حجاز کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ جنھوں نے بیگم صاحبہ کی آمد کی تقریب میں مجھے اور میری حیدرآبادی جماعت کو رات کے کھانے پر مدعو فرمایا۔ دعوت ہز اکسلنسی شیخ عبداللہ سلیمان کے ایک باغ میں ہوئی اور یہ ایک مسرت بخش بے تکلف تقریب تھی۔ مجمع کم اور بے تکلف تھا۔ میں شہزادہ کے قریب بیٹھا اور ہم نے متعدد امور پر گفتگو کی۔ بعض پسندیدہ ترقیات کے متعلق مجھے اپنے خیالات ان کو سمجھانے کا موقع ملا۔ انھوں نے بڑی توجہ سے سب باتیں سنیں اور مجھے امید ہے کہ میری بعض تجاویز ضرور ان کے دماغ میں رہ جائیں گی۔ اور رو بہ عمل آئینگی۔

عرب میں میرا دستور ہو گیا تھا کہ میں ہر وہ چیز عربوں کو سمجھاتا تھا جو میری دانست میں خود انہی کی کوشش سے ان کے حالات زندگی سدھارنے کی طرف ان کے خیالات کی رہنمائی میں مدد ہوتی۔ میں نے

ہمیشہ عربوں کو سیکھنے کا مشتاق پایا۔

آزادانہ فیصلہ کی اپنی قومی خصوصیت کو برقرار رکھتے ہوئے مشورہ سننے کو وہ ہمیشہ تیار رہتے۔

مکہ کے دوران قیام میں مجھے سلطان کے چند ممتاز درباریوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ ان میں سے ایک ہز اکسلنسی فواد ہمزہ وزیر خارجہ تھے۔ یہ معلوم کر کے بڑا چنبھا ہوا کہ وہ آسانی سے بات چیت کرنیکے لایق انگریزی بھانتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ شامی ہیں۔ ان کو بمقابلہ اور عربوں کے یوروپین کے ساتھ زیادہ ربط رہا۔

مکہ میں ایک دوسرے ممتاز عہدہ دار ہز اکسلنسی مہدی بیگ کمشنر پولس سے ملاقات ہوئی یہ مصری ہیں اور بادشاہ کے معتمد علیہ اور واقعی قابل اعتماد ہیں۔ انھوں نے پولس کی جمیعت کی تنظیم کی ہے اور اسکی ہیئت اور کارگزاری میں بڑا اضافہ کیا ہے قیام امن و آمان میں ان کی مستقل نگرانی کو بہت زیادہ دخل ہے انہیں دوسری مصروفیات کے علاوہ ہر اہم موقع پر بادشاہ کے سامنے

موجود رہنا پڑتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں آخری ملاقات کے موقع پر
میں نے انہیں ایک نہایت مفید ادارہ کے قیام کی مبارکباد دی
یہ مکہ میں قائم شدہ ایک یتیم خانہ ہے جو بڑی ذکاوت سے قائم
کیا گیا تھا۔ یہ خیال کہ ہر سال حاجیوں سے وصول شدہ رقم کا
معتد بہ حصہ عوام الناس کی بھلائی کی خاطر صرف کیا جائے قابل
تعریف ہے بادشاہ اور اس کے وزیر اس خیال کو روبہ عمل لانے کے لیے
قابل مبارکباد ہیں۔

مکہ کے دوران قیام میں مجھے مولد النبیؐ کی خالی جگہ بتائی
گئی جس میں سیدھے سادھے طریقہ پر اینٹیں جمادی گئی تھیں۔
قدیم مکان یہاں سے غائب ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہابیوں نے
مکہ پر قبضہ کے دوران میں اسے مسمار کر دیا۔ کیوں کہ مسلک وہابیہ
کا یہ ایک مشہور مسئلہ ہے کہ ایسے ظاہری آثار کو قائم نہ رہنے دیا جائے
جن کی حرمت اوہام پرستی تک جا پہونچے۔ مذہب کو اصل حالت میں
رکھنا اور اس کی ہیئت مسخ نہ ہونے دینا فی نفسہٖ بہت اچھی چیز ہے۔

لیکن اس میں حد اعتدال سے تجاوز بھی ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس عقیدہ کی متابعت میں موجودہ آثار کی تباہی کو مہذب اقوام شدید مذہبی جنون قرار دیں گی۔ عربوں کو چونکہ اب یورپ سے ربط و ضبط کے زیادہ مواقع مل رہے ہیں اور وہ اس کے تمدن کے بعض اطوار اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ یہ توقع بندھتی ہے کہ رفتہ رفتہ اصل مذہب کی بقار کے لیے وہ اس کو ناگزیر خیال نہ کریں گے۔ موجودہ دور میں بعض مقبروں کو مسمار کر دینے سے جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ فتح کے ابتدائی جوش میں ایک جنگجو قبیلہ کی کٹر مذہبی اصلاحوں کے ولولہ کے لیے کچھ گنجایش تو رکھنی پڑیگی۔ جب یہ جوش ٹھنڈا پڑتا ہے تو اس وقت سمجھ آتی ہے اور اس وقت ٹھنڈے دل سے سوچنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صورت پیش آ رہی ہے اور وہابیت میں بھی کچھ لچک پیدا ہو چلی ہے اور اب یہ محسوس کرنے کے زیادہ اچھے موقف میں ہے کہ مہذب اقوام کا یہ وطیرہ ہے کہ جہاں کہیں ان کے بڑے آدمیوں کے

آثار پائے جائیں ان کو بطور یادگار محفوظ رکھنا اور ان کے نام سے وابستہ مقامات کو کتبے نصب کر کے یا دوسرے مناسب طریقہ سے نشان زد کرنا چاہیئے۔ مکہ میں مولد النبیؐ کی جگہ ایک اسلامی کتب خانہ اور دار المطالعہ کی عمارت آپؐ کی بعثت کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنے کی بہترین صورت ہوگی۔ بارہ سال قبل یہ تجویز پیش کی گئی تھی۔ اور حیدرآباد کے حاجی احمد علاؤالدین نے اپنے صرفہ سے عمارت تعمیر کرنیکا پیش کش کیا تھا۔ ایک پرجوش مسلمان کی طرف سے ایسے فیاضانہ پیش کش کا نہایت سرگرمی سے خیر مقدم کرنا چاہیئے تھا۔

عرب ذہنیت تنگ نہیں بلکہ چنندہ ہے اور امید ہے کہ موجودہ فرماں روا کی رہنمائی میں بہت سی مفید اصلاحات نافذ ہوں گی۔ چنانچہ یہ توقع ظاہر کرنیکی ہمت بھی بندھتی ہے کہ بزرگان سلف سے متعلقہ مقامات کو جو ایک جدید دور بنانیوالے واقعات کی یادگار ہیں جن کو دنیا فراموش نہیں کر سکتی احتیاط کے ساتھ محفوظ کر دیا جائیگا ہمارے لیے سب سے نمایاں ہمارے ہادی اعظم کی جائے پیدائش ہے اور

آپ کی جائے پیدائش کے لحاظ سے دنیا میں اس سے زیادہ اور کونسی جگہ ہمارے قلوب سے ایسا خراج عقیدت حاصل کر سکیگی۔

مکہ کے بعد طائف کا خیال آتا قدرتی ہے جس کو رسول اکرم صلعم کے دور میں کافی اہمیت حاصل تھی۔ حجاز کے بنجر صحرا میں مکہ سے (۷۰) میل دور یہ ایک خوشگوار مقام ہے جو سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ بلند ہے اور جس کا اوسط درجہ حرارت (۷۵) ڈگری رہتا ہے بیان کیا جاتا ہے کہ اسکے گرد زمین کی نرم مٹی سے رطوبت کے ہلکے ہلکے انجذاب کیوجہ سے جو زرخیزی آگئی ہے وہ ہمیشہ قایم رہتی ہے اگر یہاں وسیع پیمانہ پر باغات لگائے جائیں تو موجودہ افتادہ زمین ایک ایسے وسیع تر باغ میں تبدیل ہو جائیگی جو گلشن حجاز بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس امکان کی طرف گبن[1] نے بہت عرصہ قبل ان الفاظ میں ہمیں اشارہ کیا تھا۔

"جہاں کی زرخیز زمین ریگستان عرب میں ملک شام کے میوے پیدا کرتی ہے"۔

---

[1] ایک مشہور مؤرخ

بحالت موجودہ (راس شما قطعہ لمبے زمین کے درمیان) گھر گھی خالی جگہوں پر کہیں کہیں انگور کے کنج ہیں۔ اور منتشر باغ ہیں جنہیں انار (غالباً دنیا کے بہترین) انجیر اور خوبانی بہ کثرت پیدا ہوتے ہیں معمولی محنت سے ان میں پیدا ہونے والے نفیس پھلوں کی خوبی قدرتی مٹی کی غیر معمولی زرخیزی کا ثبوت ہے۔ مناسب نگہداشت اور مقوی کھاد و کے استعمال سے اس کی پیداوار دس گنا بڑھ جائیگی۔ سنا ہے کہ بادشاہ اس طرف متوجہ ہیں زیادہ دن نہ گذریں گے کہ یہ امکان حقیقت بن جائیگا۔ بادشاہ کے وزیر اعظم شیخ عبداللہ سلیمان (رسا) تخیل کے آدمی ہیں اور ہمیشہ ذہن میں ایک مرفہ الحال ملک کا تصور رکھتے ہیں۔ وہ بھی زیادہ دنوں تک طایف کو غفلت کا شکار نہ ہونے دیں گے۔ طایف جانے والی سڑک پر آدھی سبیل یعنے (تھاؤ) نامی ایک مقام ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہاں قدرت دریا دلی کے ساتھ فیاض ہے۔ پانی ایک بڑے ڈھلاؤ سے بکھرتا ہوا ایک مقام تک پہونچتا ہے جو خود ایک کم ڈھلاو والی پہاڑی کا جزو ہے نیچے

بہتے ہوئے اس کا دھارا بڑا بن جاتا ہے۔ پانی ایک اتھلے سطح گڑھے میں جمع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ ایک جھیل کی شکل بن جاتا ہے جس سے عزم انسانی کو ایک بہت بڑی گنجائش کے مفید تالاب کی تعمیر کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔

عرب کے ریگستان میں سفر کرتے وقت ملک کے نمایاں خدو خال یعنی پہاڑیاں میدان ہوا سے اڑنیوالے ریت کے تودے جانوروں کی چند قسمیں جو وہاں نظر آتی ہیں سب میرے لیے عجیب قسم کا پر اسرار اچنبھا تھے۔ یہ سب اسی ریگستانی زمین کا جزو ہیں اور اسے حقیقت بتاتے ہیں۔ گھسی ہوئی ہڈیاں جو کاروان کا نشان راہ ہیں اس بڑے قانون قدرت کی یاد دلاتی ہیں جو ہر جگہ مصروف عمل ہے۔ ریت پر پڑی ہوئی وہ مجسم وعظ معلوم ہوتی ہیں۔ پہاڑیوں میں غار اور رود ادیاں اس لا انتہا کنکریلے راستہ کی ضد ہیں جن پر سفر کرنا پڑتا ہے لیکن وہ بھی بجائے خود دلکش ہیں۔ جب کبھی میں ان میں سے کسی کو دیکھتا تو بڑی شد و مد سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا قرآن کی بہ کثرت

مختصر اور واضح بیانیہ سورتوں کی توثیق کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔ وہ آیت قرآنی کے مفہوم کو تصویر کی شکل میں ظاہر کرتے ہیں اور ذہن کو بیانات قرآنی کے عین مشابہ فطرت ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔

۱۹۳۴ء میں دوسرے سفر کے موقع پر خوش قسمتی سے مجھے طائف میں چند دن گزارنے کا موقع ملا۔ ایک شام سلطان سے ان کے قصر میں ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ ایک نئی شاندار خوشنما عمارت ہے جو کسی قدر جدید طرز پر اس کے سابق مکین شریف علی نے بنوائی تھی۔

ہال میں داخل ہونے پر بادشاہ کے پرائیوٹ سکریٹری سے ملاقات ہوئی یہ شام کے رہنے والے ہیں جو مجھے ایک شاندار زینہ سے اوپر لیگئے جسکی سیڑھیوں پر دو طرفہ بادشاہ کے خدام اپنے قابل دید نجدی لباس میں ملبوس کھڑے تھے زینہ کے ختم پر ایک پیش دالان میں پہونچا جہاں بہت سے عرب تھے بعض بیٹھے تھے اور بعض چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم کھڑے تھے۔ یہ بڑا شاندار منظر تھا۔ یہاں سے مجھے دربار ہال میں لیجایا گیا جہاں کے کونے پر بادشاہ تشریف فرما تھے اور دونوں طرف

دیواروں سے لگے ہوئے نجدی اور دوسرے عرب بیٹھے تھے۔ یہ بھی سادہ عظمت کا ایک منظر تھا جس میں الف لیلہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ کوئی حدیث کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا اور سب مؤدب طریقہ پر خاموش تھے اور میں اس مداخلت بیجا پر جس کا غیر ارادی طور پر مرتکب ہوا۔ افسوس کرتا ہوا آہستہ آہستہ بادشاہ کے قریب آ رہا تھا جب مجھے یاد آیا کہ بادشاہ کی عادت ہے کہ وہ بعد نماز عشاء حدیث کی قرأت کے دوران میں ملاقاتیوں سے ملتے ہیں تو مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ بادشاہ نے حسب معمول صاف دلانہ شفقت سے میرا خیر مقدم کیا۔ اور مجھے اپنی بائیں طرف نشست دی لیکن حدیث ختم ہونے تک وہ خاموش رہے۔ ان کے برتاؤ بلکہ ان کی ساری عادتوں میں نمایاں ان کی پرسکون بردباری ہے جو ان کے شاہانہ طرز عمل کے طفیل اعزاز کی بلندیوں تک پہونچ جاتی ہے۔ طائف کو روانگی سے قبل میں مکہ میں ان سے ملا تھا۔ ٹیلیفون رسیور ان کے ہاتھ میں تھا اور وقتاً فوقتاً اپنی فوج کے مستقر موقعہ یمن سے آنیوالی

خبریں سن لیتے تھے۔ یہ ان کی سیرت کا ایک دلچسپ پہلو تھا۔ اور وہ مجھے مرد باعمل اور سپہ سالار افواج نظر آئے۔ دوبارہ طائف میں جنگ یمن کے دوران میں میں نے انہیں حسب معمول ضابط پایا۔ وہ پیدائشی فرماں روا ہیں۔ حدیث سنتے وقت جنگ کا خیال بالکل ان کے ذہن سے اتر گیا تھا۔

طائف میں مفتی اعظم فلسطین حاجی سید امین الحسینی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی فلسطین میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی غرض سے چندہ جمع کرنے جب آپ حیدرآباد آئے تھے تو اس وقت اس سے قبل ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں موقعوں پر ان کے ساتھ محمد علی الوبا پاشا بھی تھے جو مصر میں وزیر رہ چکے تھے۔ شریف مشرق کی طرح میں نے ان کو منجھے ہوئے آداب تہذیب اور ذوق لطیف کا حامل پایا۔ طائف میں ان کے ہمراہ شکیب ارسلان نامی ایک صاحب اور بھی تھے یہ سب سلطان کے مہمان تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب حجاز و یمن کے اختلافات کے تصفیہ میں سہولت پیدا کرنے والی

تجاویز پیش کرنے آئے تھے۔

یہ واقعہ اس زمانہ سے بہت قبل کا ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مفتی اعظم خود اپنے ملک میں انگریز حکام کی نظروں میں مشتبہ قرار پانے کی وجہ سے کچھ عرصہ تک مصائب کا شکار رہے۔ مجھے ان کی سیاسیات سے دلچسپی نہ تھی اور نہ ان کی مصروفیات کا زیادہ علم تھا۔ ان کے متعلق میرا تأثر یہ تھا کہ ان کا انداز گفتگو خوش کن ہے۔

مکہ مقدس سہی لیکن قلب مسلم کو مدینہ میں زیادہ سکون ملتا ہے یہاں ایک بڑی مقناطیسی قوت کام کر رہی ہے اور یہ کشش دنیا کی ممتاز ترین ہستی کی ہے۔ ابھارنے والی طاقت کی حیثیت سے آج بھی اتنی ہی طاقتور ہے جتنی کہ ساڑھے تیرہ سو سال قبل وہ ایک ناقابل مزاحمت عملی قوت تھی۔ مدینہ سے مجھے روحانی فیضان ملتا ہے اور طاقت حاصل کرتا ہوں۔ کیوں کہ محض اس کا خیال کہ یہاں کیا ہوا۔ اور یہاں سے کیا گیا ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کرتا ہے کہ مذہبی جذبات کے

سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔

مدینہ کے تعلق سے آپکی ایک نظم جو پراثر اور دلچسپ ہے یہاں درج کیجاتی ہے۔ اگرچہ کہ یہ نظم عربیہ سنگتا میں نہیں ہے۔

ندائے مدینہ

اسی خاک مدینہ سے اٹھا جب شعلہ ایماں کا
نیا عالم نظر آیا وہ عالم تھا مسلماں کا
جہاں آتشکدوں میں ہوگئی زیر زمیں آتش
فلک پر پھر ہوا روشن ستارہ اوج ایماں کا
عراق و شام پر سے جب اُٹھا اوہام کا پردہ
نئی شوکت تھی دنیا کی نیا فر چرخ گرداں کا
وہ دنیا تھی خدا ہی کی زمین و آسماں اُس کا
وہ خالق تھا وہ مالک تھا وحوش و جن و انساں کا
پیمبر کبھی اُسی کے تھے نہ دعویٰ تھا حکومت کا
رسالت اک ہدایت تھی خلاصہ اُسکے فرماں کا

کہاں خسرو کہاں قیصر وہ سارے مٹنے والے تھے
یہی تقدیر کا منشا یہی تھا حکم دوراں کا

شہنشاہِ جہاں سے بھی تھا رتبہ جس کا بالاتر
فقیری میں اُسے تھا فخر اپنے عُسرِ شاداں کا

نہ ہرگز طالبِ زینت نہ محتاج زر و گوہر
دلِ صادق جو مخزن تھا کلام حق و عرفاں کا

اگر تھی شام تک محنت تو ساری شب عبادت تھی
قناعت کا ہر اک فاقہ سپاس اپنے نگہباں کا

حفاظت دین کی ہر دم صیانت قوم کی ہر دم
عملِ صالح مصیبت میں سپر تھا مردِ میداں کا

ہوئی جب اس سعادت سے مسخر قوم اعدا کی
کرم فتوی تھا فاتح کا عفو مژدہ تھا احساں کا

خلیفہ اس شہہِ بے تاج کے عالم میں غالب تھے
یہ عالم شام و ایراں کا وہ مصر افریقہ و ہسپاں کا

نہ دولت سے، نہ شوکت سے فقط ایماں کی قوت سے
ملا اسلام کو درجہ جہاں میں تھا جہانباں کا
مدینہ اس کا مرکز ہے یہی دارالحکومت ہے
یہی سرچشمہ عزت کا یہی اسلام کی جاں کا
ابھی تک موجزن ہے یاں شعاع نور اسلامی
اگرچہ سایہ عارض ہے کسی ادبار پنہاں کا
اگر مفقود دولت ہے تو کیا مفقود ہمت بھی
فلاکت میں بھی سر اونچا کہاں ہے اب مسلماں کا
مسلمانوں کی غفلت سے مسلمانوں کی ذلت ہے
مقام حیف و عبرت ہے یہ منظر شہر ویراں کا
مگر اسلام کی ہمت کریگی اس کو پھر زندہ
یہی ویرانہ پھر ہوگا نمونہ باغ رضواں کا
یہاں گرد و غبار فقر میں پنہاں ہے نور حق
یہاں ہر ذرہ ذرہ بھی ہے مظہر شمس تاباں کا

نہیں! یوس ہوں گے ہم کبھی قادر کی قدرت سے
دل مومن خدا کا گھر نہیں محتاج ساماں کا
مسلمانانِ عالم تم (تونگر ہو کہ مفلس ہو)
کرو اس شہر کی خدمت اگر دعویٰ ہے ایماں کا
کشش دل کو ہے مومن کے شمال و شرق و مغرب
جہاں مومن کو ملتا ہے خزانہ نورِ ایماں کا
نہ یہ ایمان توہم ہے نہ یہ ایمان تصوّر ہے
نہ لفظوں ہی میں رکھا ہے ذخیرہ اسکے ساماں کا
عمل ان کی وصیت ہے کہ جن کے پاک ہاتھوں سے
بنی اسلام کی دنیا نتیجہ دل کی ارماں کا
عمل سے اُسوۂ حسنہ ملا تھا جب لقب اُن کو
عمل تقلید ہے اُنکی عمل ہے حکم قرآں کا
کہو کیا صرف ناموں سے کہو کیا صرف باتوں سے
بنو گے اُمّتی اُن کے لقب لوگے مسلماں کا

جب
اُٹھو اب خوابِ غفلت سے مدینہ کی طرف دیکھو
ہر اِک دل میں مدینہ ہی ہما وطن ہے ہر مسلمان کا
جو اپنے گھر سے آیا ہو۔ رسول اللہ کے گھر میں
تو ان کا جو طریقہ تھا وہی ہو ان کے مہماں کا
کرے وہ قوم کی خدمت یہی مقبول ہے سنت
یہی مقصد عبادت کا یہی شیوہ ہے ایماں کا
وہ دولت دے وہ محنت دے وہ دل دے فی سبیل اللہ
کہ احساں سے ملے اُس کو دوامی اجر احساں کا
خدایا ہر مسلماں کو عمل کی تو ہی طاقت دے
کہ دعوائے مسلمانی مسلّم ہو مسلماں کا

تاریخ میں مدینہ ان قوتوں کا نقطہ آغاز ہے جس سے ان بڑی تحریکوں کی بنیاد پڑی جسکی تکمیل شدہ شکل کو ہم اسلام کا نام دیتے ہیں خلافت کے زرمینہ نام کے تحت مسلم فرماں روائی کا زمانہ مختلف النوع رہا۔

حتیٰ کہ یہہ فرماں روائی گئی صدیوں تک ترکوں کی میراث رہی۔ اپنی وسیع قلمرو اور زبردست فوجی طاقت کی بناء پر سلاطین عثمانی مکہ اور مدینہ کو ان کی موزوں حیثیت یعنی اعلیٰ درجہ کے ام البلاد بنا دینے کی اچھی کوشش کر سکتے تھے۔

مدینہ کے دوران قیام میں میرا خاص مشغلہ ان مقامات کی سیر تھا جہاں پیغمبر کائنات کی ذاتی مصروفیات سے وابستہ کوئی واقعہ گزرا تھا۔ میں آپؐ کو مرتاض نہیں بلکہ مرد باعمل کی حیثیت سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ میرا ایقان ہے کہ صرف وہی ایک ایسے بڑے مذہبی رہنما اور مصلح اخلاق ہیں جو اپنے مقصد کی تکمیل تک زندہ رہے اور جنھوں نے اپنے دوران حیات میں اپنے کام کی تکمیل کر لی مذہب سے ملکر بنی ہوئی ایک عظیم الشان عمارت ان کی نگرانی میں اور ان کے ہاتھوں تراشی گئی اور مکمل ہوئی اور آج تک تقریباً اپنی اصلی حالت میں قائم ہے۔

چہ بختِ عرب بر عجم چیرہ شد ہمیں بخت ساسانیاں تیرہ شد

ان یادگار اشعار میں فردوسی نے بادشاہوں کی سرزمین کا خاتمہ تحریر کیا ہے لیکن یہ کسی کا خاتمہ اور کسی کا آغاز تھا۔

بغداد کی عظمت کی تابانی اور عزّ و ناطہ کے کرّ و فر سے منور کیسی یادوں کا ہجوم ہے لیکن فوراً آنکھوں کے سامنے صحرا کا بے نقش و نگار پردہ گرتا ہے ؎

یہاں گرد و غبار فقر میں پنہاں ہے نورِ حق
یہاں ہر ذرّہ ذرّہ بھی ہے مظہر شمس تاباں کا

مدینہ کے اطراف بعض مقامات سے ایسے قصّے تازہ ہوتے ہیں جو اکثر ذہن میں منڈلاتے جو ہمیشہ میرے نزدیک واقعات رسالت

کی جیتی جاگتی تصویر رہی ہے۔ اس رسول صنعم کے اس مقام پر
فیوز۔ سرخوشی کے عالم میں مبارکباد کے گیت گا گا کر دشیز گان کا
ان کا استقبال آپؐ کے اونٹ کا اس جگہ پہونچنا جہاں اب مسجد
قایم ہے اور اس کا نیک شگون قرار دیا جانا اور فی الحقیقت اپنے
ہاتھوں سے سنگ بنیاد ڈالکر خانہ خدا کے حدود کے تعین کے لیے
رُک جانا سب یاد آتے ہیں۔ یہ سب واقعات مجھے اس طرح یاد آتے
ہیں گویا وہ درحقیقت میری آنکھوں کے سامنے واقع ہو رہے ہیں اس
مسجد کی سادہ اور غیر مزین عمارت جس کا سامنے کا سفید رخ شاندار کمانوں
کے سہارے استادہ ہے۔ رفعت اور خوشنمائی کا نشان ہے۔
خصوصیات جو اسلام کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ ہیں اسے دیکھ کر مجھے
سکون کامل کا احساس پیدا ہوتا ہے جو سکون ابدی کا پیش خیمہ ہے۔

مدینہ سے فاصلہ پر ایک اور جگہ ہے جو ایک
بہت اہم وحی قرآنی سے وابستگی کی وجہ سے مقدس ہو گئی ہے جس نے
کعبہ کو اسلامی طریقہ پر عبادت کا قبلہ بنا دیا پیام اسلام کے اعلان کے

بعد سے رسول (اور ان کی اتباع میں مسلمان) بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے لیکن اس سے مذاہب کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ تھا اسلیے اسلام کو فطرتاً اپنی علیحدگی کو محفوظ رکھنے کی ضرورت ہوئی تاکہ اس کا علیحدہ اور آزاد ہونا تسلیم کیا جائے۔ حامل قرآن کا وجدان بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوا اور وحی کی شکل میں اسے حکم کا درجہ دیدیا گیا۔ اس وقت سے روایتاً یہ بات مسلمانوں میں چلی آتی ہے کہ حوالی مدینہ میں اس سے تقریباً تین میل دور قبلتین (جسکے معنی دو قبلہ کے ہیں) نامی ایک پرانی مسجد ہی وہ جگہ ہے جہاں سب سے پہلے اس جماعت کے سامنے جو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کر چکی تھی۔ اس وحی کا اعلان ہوا۔ یہ سنکر اس جماعت نے فوراً کعبہ کی طرف رخ کر کے دوبارہ نماز پڑھی۔ پہلی مرتبہ اس ویران مقام پر پہنچکر جب میں نے اس بدوی عمارت کو دیکھا جو مسجد برائے نام ہے تو میں اس کے ویران نظارہ سے مضطرب ہوگیا ایسے موقعوں پر معمول کے مطابق مجھ میں احساس طمانیت بلکہ فخر و مباہات پیدا ہوا۔ اور میری نظر میں اس مقام کے روحانی پیام کا

صاف ہو بہو نقشہ کھنچ گیا۔ ایک سنسان وادی میں موقوعہ یہہ مسجد
اس وقت سے ذہن میں حسن اسرار معرفت کا ایک خاکہ ہے۔
مدینہ سے نظر آنیوالے یادگاروں سے ملواور تنازخمی بدشگونی سے
وابستہ ایک اور اہم مقام بھی ہے۔ یہہ اُحد کی پہاڑی ہے۔
مسلمان مدینہ اور کفار مکہ کے درمیان اس کے سامنے ایک لڑائی لڑی
گئی تھی گو یہہ ایک معمولی جھڑپ تھی لیکن اسکے نتیجہ پر بہت ہی اہم باتوں کا
انحصار تھا۔ ایک حادثہ فاجعہ میں رسولؐ خود بھی زخمی ہوئے اور آپکا
ایک دندان مبارک شہید ہوا۔ آپؐ کے چچا حضرت امیر حمزہؓ اس لڑائی میں شہید
ہوئے آپ پہاڑی کے سامنے مدفون ہیں آپکا مزار شہادت سے مفتخر اسلامی
کارناموں کی اولین یادگاروں میں سے ایک ہے۔ میں بارہا اسکے سامنے
کھڑا رہا ہوں۔ اور ہر دفعہ یہہ محسوس ہوتا تھا کہ شہیدؓ کا شجاعانہ روحانی
فیضان میرے اندر سرایت کر رہا ہے۔

مدینہ کا قبرستان جنت البقیع متوفیان اعظم، بزرگان دین،
شہدائے ملت اور غازیان اسلام کی آخری آرامگاہ بجائے خود یادگاروں کی

ایک دنیا ہے۔ یہاں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر کے عزیز اور خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ محو خواب ہیں۔ ان کے مقبرے سنگ مرمر کی شاندار عمارتیں نہیں ہیں۔ لیکن ایک انگریز شاعر کے الفاظ کی یاد دلاتی ہیں۔

"جہاں زمین ڈھیروں کی بہت سی گرتی ہوئی شکل میں نظر آتی ہے"۔

یہ قبرستان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار سے قریب ہے اور ایک شاہد کی اس پر سے گزرتی ہوئی احد تک پہونچنے والی نظر تاریخ اسلام کے نظاروں سے تخیل کے پروں پر جا پہونچتی ہے۔ دیگر اسباب کے علاوہ اس وجہ سے بھی مدینہ قلب مسلم کا مسکن ہے۔ اور زندہ ہیں کے نام اس کی پکار دائمی ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ دوسرے جذبات مدہم پڑتے جاتے اور مٹتے جاتے ہیں لیکن یہ احساس غیر متاثر رہتا ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ صحرائی سفر میں لب سڑک نظر آنیوالے نظاروں میں سے بعض بہت بھاتے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز سراب ہے جو قدرت کے راز ہائے سربستہ میں سے ایک ہے۔ مسافر کی تھکی ہوئی آنکھیں جب چاروں طرف پھیلی ہوئی جگمگاتی ریت کے لامتناہی خطہ کو گھورتے گھورتے دیکھنے لگتی ہیں تو اچانک نظروں کے سامنے ایک خوبصورت دیہاتی سماں آموجود ہوتا ہے جس میں اصلی سماں کی تمام جزئیات موجود رہتی ہیں ایک نیلگوں جھیل یا ندی اور اس کے کنارے خوبصورت کھجور کے طرّہ دار درخت۔ کہیں کہیں پیچ و خم سے متصل خوبصورت تنگ گھاٹیاں اور میدان جن کے دیکھنے سے نظر سیر نہیں ہوتی۔ منظر کی اصلیت اتنی یقین آخریں ہوتی ہے کہ قوت فیصلہ اس سے مبہوت ہو کر شش و پنج میں پڑ جاتی ہے۔ مدینہ کے دوسرے سفر میں مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہوا۔ دوپہر کے آفتاب کے نیچے ہماری موٹر تیزی سے بھنستی ہوئی چل رہی تھی اور مجھے فکر تھی کہ زیادہ دور چلنے سے قبل کوئی سایہ دار مقام نہ آئے جہاں اتر کر نماز ادا کر سکوں جونہی میں نے نظر اٹھا کر آگے دیکھا تو ..... میرے سامنے ہی کھجور کے درختوں کا ایک

خوبصورت جھنڈ تھا۔ جس میں سے ایک سیمیں ندی پیچ و خم کھاتی گزری تھی۔ کار چلتی ہی رہی اور میں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ کئی منٹ گذرے اور مجھے احساس بھی نہ ہوا لیکن پھر بھی کوئی ایسا مناسب مقام نہیں آیا جہاں میں وضو کر کے نماز پڑھنے کی غرض سے موٹر ٹھیرا کر اترتا۔ اور پھر وہ طلسمی منظر یکایک غائب ہو گیا جیسا کہ وہ ظاہر ہوا تھا۔

. . . . . .

سراب بجائے خود کچھ ہی سہی۔ بعض اوقات میں سوچنے لگتا ہوں کہ زندگی کے دل خوش کن ترین نظارے جو ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں کہیں سراب ہی نہ ہوں۔

اب یہ سنئے کہ ایک گڈریا دیہات کی خوش منظری کو سراب میں کس طرح دیکھتا ہے۔

ایک ریگستانی خطہ میں ایک عورت کی تنہا شبیہ کے چاروں طرف بھیڑ بکریاں پھیلی ہوئی ہیں۔ چھریری کشیدہ قامت عورت انداز ملکونہ کے ساتھ بے حس و حرکت کھڑی ہے اور ایک طویل ڈھیلے

ڈھالے سیاہ لباس میں ملبوس ہے۔ آسمان اور ریت کے خالی پس منظر میں اسکے جسم کے خطوط صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ اسکی شکل نظر آتی ہے لیکن چہرہ جو پوت اور سلمہ ستارہ سے بھدے طریقہ پر مزین سیاہ نقاب سے ڈھکا ہوا ہے نظر نہیں آتا۔

میں نے انداز ملکونہ کا تذکرہ کیا تھا لیکن یہہ انداز اسے کس سے اور کہاں سے ملا ہے؟ اس قسم کی تصاویر سے پیدا ہونیوالے خیالات ارتقاء و تزکیہ نفس کا باعث ہوتے ہیں۔ اور قلب کو شکر گزارانہ قناعیت اور خدا کی فیاضی اور نعائم کی پرستش سے لبریز کر دیتے ہیں۔ صحرائے عرب کا ہر ایک منظر میری دانست میں خود اعتماد عرب سرشت کے ناقابل التسخیر ہونیکی تفسیر ہے۔ اگر میری مرحوم دوست مسز نائیڈو زندہ ہوتیں اور اسے پڑھتیں تو فوراً کہتیں۔

"فارس کے قدیم پجاریوں کے مزاروں سے گاتھک ہسپانیہ تک!"

تقریباً ۱۹۰۸ء میں لکھی ہوئی میری ایک نظم کے ان اشعار نے ان پر جادو کا اثر کیا تھا اور وہ ان کو اپنی تقریروں میں اکثر سنایا کرتی تھیں۔ میں اپنے اس بیان پر بہ عجز و انکسار معذرت خواہ ہوں اور درگذر آپ کے اختیار میں ہے۔

صحرا کے طویل سفر کی اکتا دینے والی یکسانیت میں ایک خوشگوار وقفہ سا محسوس ہوتا ہے جب حاجیوں کا قافلہ ٹھہرنے کے مقامات پر پہونچتا ہے۔ یہ مقامات کسی طرح بھی گاؤں یا قصبہ نہیں کہلاتے۔ بلکہ یہاں وسیع سائبانوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جنکی چھتیں کھجور کے پتوں سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہیں اور اس میں کئی سو آدمی طعام و قیام کے لیے سما سکتے ہیں۔ یہ جذبہ اخوت سے سرشار رہنے کی جگہیں ہیں اور ان سے آزادی اور مساوات کی بو آتی ہے جو عرب کا سرمایہ حیات ہے۔ پروردگار کی نعمتیں ہر ایک کی دسترس میں ہیں نیز ہر اچھی سکی ہوئی روٹیوں کے ڈھیر دبدہ زیب بے ترتیبی کے عالم میں پڑے ہوئے بے شمار تربوزوں کے انبار خوب میٹھی بھیڑ دودھ کی گچرم چائے جو گلاس

میں پیش کیجاتی ہے اور اہمیت میں کسی چیز سے کم نہیں ہے۔ بلکہ میرے میزبان کے مرغوبات میں سب سے خوش ذایقہ اور عربی قہوہ کی جدید رقیب جسکی جگہ افسوس وہ چھین چکی ہے۔ وافر مقدار میں نظر آتی ہیں۔ روانگی کے وقت طوعاً و کرہاً ان سائبانوں سے نکلنا پڑتا ہے اور روانگی کے بعد جلد ہی دوسری قیامگاہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔

مدینہ کے پہلے سفر کے موقع پر دل میں یہہ خواہش تھی کہ کاش تمام راستہ چھوٹے چھوٹے مسافر بنگلے ہوتے اور خدائے غائبانہ میری یہ آرزو پوری کردی۔ دوسرے سفر میں میں نے دیکھا ابیار ابن حصانی اور مسیجد پر ایسی عمارات قایم ہیں۔ یہہ دیکھ کر کے مجھے سوجھی کہ رابغ میں بھی ایک ایسی عمارت ہونی چاہیئے جو ایک اہم ٹھہرانیکا مقام ہے۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے میں نے یہہ اقدام کیا کہ میں نے چند اپنے حیدرآبادی دوستوں سے جمع شدہ چندہ سے اس کے خرچ کی سیل کا پیشکش کیا۔ ۱۹۳۸ء میں مکہ چھوڑنے سے قبل (میرا چوتھا سفر) میں اپنے دوست ہز اکسلنسی شیخ عبداللہ سلیمان سے اسکی جلد تکمیل کا وعدہ

لینے میں کامیاب ہوا۔ میں مشکور ہوں کہ انھوں نے سال بھر کے اندر ہی اس وعدہ کی تکمیل کی اور مجھے اس عمارت کا ایک چھوٹا سا فوٹو بھیجا جس کو میں نے بطور یادگار محفوظ کر لیا ہے۔

مسیجد کے آگے مدینہ سے ایک منزل کے اندر ایک گھاٹی میں سے گذرنا پڑتا ہے جس کے دونوں طرف ایک طویل پہاڑی سلسلہ ہے اس میں بڑے بڑے سنگریزے بچھے ہوئے ہیں جن کا سلسلہ کئی میل تک ہے اور اس میں سفر ایک بھیانک مہم ہے لیکن ایک زیادہ مسرور کن منظر پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اس وادی کا حصار کرنیوالی پہاڑیوں کے بیرونی حاشیہ کا اولین نظارہ جس میں مدینہ واقع ہے کسی بلندی سے دور کے نشیب میں واقع شہر کی پہلی جھلک اس کا سبز گنبد اور سر بفلک سفید مینار دیکھنے والے پر عجیب حیرت انگیز باطنی اثر کرتا ہے یہ نظارہ دل میں بے قابو کر دینے والی مسرت پیدا کرتا ہے جو انتہائی شدید اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔

مشرقی روما کی اقلیم کے اجنبی ہمسایہ کی حیثیت سے اسلام کے

عروج پر غور کرتے وقت میں مکہ کو وعدہ (فتح) اور مدینہ کو اس کی عظمت کی تکمیل سمجھتا ہوں۔ دس بارہ ماہ کی انتھک کوششیں اور بظاہر ناتمام آرزوئیں یہ تو وعدہ کی ظاہری شکل تھی اسکے بعد تکمیل کی سحر کی پہلی علامات نمودار ہوئیں یعنی رسول کی ہجرت سے وہاں ایک نئے زمانہ کی آغاز ہوئی جو خدا کی ہدایت سے اپنی جبلی طاقت کی بدولت روز افزوں ترقی کرتا ہوا قدیم حکومتوں پر محیط ہوا۔ اور ان سے روحانی خراج اور وابستگی بھی حاصل کی اس شاندار واقعہ کا پہلا دور وصال نبوی کے بعد کے بارہ سال تک رہا۔ محیر العقول بات تو یہ ہے کہ اس حادثہ کے بعد یہ خواب بن کر نہ رہ گیا۔ بلکہ اس کی ہیئت اور واضح ہوگئی۔ اسکی تابانی میں خیرگی اور بڑھ گئی اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اس عظیم روح کی رہنمائی میں جس نے ایک نئی دنیا کی تخلیق کی تھی یہ تہذیب کا سیلاب آگے ہی آگے بڑھتا معلوم ہوتا تھا۔

مدینہ مجھے یہ سب کچھ یاد دلاتا ہے اور میں وہاں روح اسلام سے ملنے جاتا ہوں جو اپنی پوری حالت عروج میں ہوتی ہے۔ عظمت و طاقت کے کوئی ظاہری آثار وہاں نہیں ہیں جو روحانی تکمیل کے احساس کو مکدر کر سکیں۔ شہر کی تباہ حالی کا منظر اس کے پیام کی تقویت میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔

مدینہ کے نام

انگریزی نظم کا سادہ ترجمہ

اے میرے قلب کے مسکن مدینہ! تیری ہی صدا ہے
جو صدیوں پر سے گزر کر گونجتی سنائی دیتی ہے
وہ صحرا اور سمندر کے ہوا پر سوار ہے۔
اور مجھ تک پہونچتی ہے ایسے وقت جبکہ بادشاہوں اور
سلطنتوں پر زوال آرہا ہے۔
یہ تقدیر کو مسخر کر لیتی اور غالب آجاتی ہے
اقوام کی پر فریب امیدوں پر

اور عظمت کے پریشان کن خوابوں پر جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔
لیکن جن کے گمراہ قلوب مسرت پاتے ہیں۔
تیری صدا مذہب کی ہے۔
مصائب ارضی اور فضول خواہشات سے دور رکھتی ہے
لڑائی سے بالاتر تیرا نفس صلح کا ہے۔
مذہب کے نام سے طاقت استعمال نہ کرنے کا پیام تیرا ہی ہے۔
مجروح عزت و افتخار کے لیے
رحمت خداوندی کا پیام تیرا سرمایہ حیات ہے۔

تمت

مرقوم

بماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۷۳ھ

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
ACC NO.
★ MAILSI ★

[م جھرل]

18 FEB 2021